سرائیکی کلاسیکی مرثیے کے ارکان خمسہ

[1] مرید حسین عارف [2] رابعہ بتول [3] ڈاکٹر محمد ممتاز خان

Abstract:

Epic Usually ends at elegy. Saraiki Poetry begins from elegy. Saraiki Poetry has a long tradition in the historical incident of Karbala. In a specific sect of Muslims this incident is a part of their faith. In this point of view elegy shaped itself as a fun and craft. In this Article it is told about the Saraiki elegy's top five reciters who established the Skelton and shape of this Art.

Keywords: Saraiki Elegy, Tradition, Epic, Battle, Karbala, Iraq, South Punjab

کلیدی الفاظ: مرثیہ، سرائیکی مرثیہ، رزمیہ، بزمیہ، روایت، جنوبی پنجاب، کربلا، عراق

مرثیہ سرائیکی کی سب سے بڑی اور قدیم صنف ہے۔ مرثیہ مادری زبانوں میں سب سے زیادہ سرائیکی زبان میں لکھا گیا۔ یوں توں سرائیکی مرثیے میں بڑے بڑے نام ہیں جن کی شاعری فکر و فن کے حوالے سے معتبری کا درجہ رکھتی ہے۔ ان میں غلام سکندر غلام، مولوی فیروز، سید گانموں، شاہ واصف، سید علی شاہ چھینوی، بخش فدوی، محمود مولائی، سید ذوالفقار علی شاہ شیرازی، غلام حسن شاہ تائب، غلام حیدر فدا، گل محمد عاشق ملتانی، آغا شرف، مولوی نذر حسین ترک، نورنگ گدائی، سید امام علی شاہ شفیق، غلام علی گنگاہ مداح، فدا حسین مشکور، نذر حسین، ارشاد عباسی، احمد بخش بھٹی سیف، جانباز جتوئی، غلام محمد محمودی، سرور کربلائی، حسین گوہر اور سید محمد علی شاہ جوہر شامل ہیں۔ لیکن سرائیکی کلاسیکی مرثیے کے ارکان خمسہ غلام سکندر غلام، مولوی فیروز، سید علی شاہ چھینوی، غلام حیدر فدا اور سید امام علی شاہ شفیق ہیں۔

غلام سکندر خان غلام (۱۸۰۲ء۔۱۹۰۲ء):

غلام سکندر خان غلام قصبہ سیال ضلع بھکر میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام فتح محمد خان تھا، فتح محمد خان خود بھی شاعر تھا، ان کی فارسی کی مناجات قلمی صورت میں موجود ہے۔ غلام سکندر غلام کے آباء و اجداد صوبہ بلوچستان سے ہجرت کر کے قصبہ سیال میں سکونت اختیار کی۔ وہاں پہ ۱۸۰۲ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔[۱] ان کا خاندان زمانہ قدیم سے شیعہ اثناعشری مسلک کا عقیدہ رکھتا تھا اور یہ لوگ عزاداری کرتے تھے۔

---

۱ لیکچرر سرائیکی، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج، فاضل پور

۲ لیکچرر سرائیکی، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین، نواب پور (ملتان)

۳ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ سرائیکی، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

غلام سکندر خان غلام سے پہلے سرائیکی مرثیہ دفعہ کی صورت میں لکھا جاتا تھا۔ دفعہ میں مسلسل دوہڑے ہوتے تھے۔ ہر شہادت پر علیحدہ علیحدہ دفعہ لکھا جاتا تھا۔ مجلس میں دوہڑے پہ دوہڑا پڑھا جاتا تھا۔ مجلس میں نثر کا امتزاج نہیں ہوتا تھا۔ مرثیہ میں شاعری کے ساتھ نثر کی ابتدا غلام سکندر نے کی۔ سرائیکی مرثیے میں ہیئت کی تبدیلیاں بھی ان کی مرہونِ منت ہیں۔ انہوں نے مرثیے کے پرانے ڈھانچے کو توڑ کر نیا رنگ دینے کی ابتدا کی:

''استاد الشعراء خان غلام سکندر خان سے پہلے مرثیہ دبیر و انیس کے تتبع میں دفعہ کی شکل میں یعنی مسلسل دوہڑے کی ہیئت میں لکھا جاتا تھا، سب سے پہلے سرائیکی زبان کے شاعر استاد الشعراء خان غلام سکندر خان نے مرثیہ کو ہیئت کے لحاظ سے نئے پن کا لباس پہنایا۔ مرثیے کو پرانی ہیت سے تبدیل کر کے اس میں بحر، مسدس، نوحہ، دوہڑا، قصیدہ، مخمس، مثمن، ترکیب بند، ترجیع بند، نثر کو سرائیکی مرثیہ میں شامل کر کے سرائیکی مرثیے کو چار چاند لگا دیے۔''[۲]

غلام سکندر خان غلام کی مرزا دبیر سے خط و کتابت تھی، اس لیے ان کی شاعری میں لکھنوی اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس بات کو زوار حسین بھٹہ نے اپنے ایم فل اردو کے مقالے میں ''سرائیکی اور اردو مرثیہ کا تقابلی جائزہ'' میں یوں بیان کیا ہے:

''غلام کے مرثیے کی فنی پختگی، مضامین کی وسعت اور زورِ بیان لکھنوی اردو مرثیہ نگاروں کی مرہون منت ہے۔ کیوں کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے ساتھ ان کا خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے مرثیوں، نوحوں، بندوں، دفعوں، خمسوں، سلام اور نثری حصوں سے ان کی قدرت بیان، علمیت اور فکری عظمت واضح ہو جاتی ہے۔''[۳]

خمسہ سرائیکی زبان کی وہ صنف ہے جس میں صرف مرثیہ لکھا گیا ہے۔ اور اس صنف کے موجد بھی غلام سکندر غلام ہیں۔ خمسہ جیسے نام سے ظاہر ہے پانچ مصرعوں پر مشتمل صنف ہے۔ خمسہ کے پہلے تین مصرعے آپس میں ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اگلے دو مصرعے ان سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اس مختصر سرائیکی شعری صنف میں غلام سکندر غلام نے واقعہ کربلا کے ہر

موضوع کو سمایا ہے۔ عصر کا وقت ہے، سب عزیز و اقارب، یار و انصار مارے گئے ہیں۔ جسم زخموں سے چور ہے۔ آخری بار بہنوں سے وداع کرنے کے لیے خیمے کے دروازے پہ سر جھکائے کھڑے ہیں۔ بے وارث بیبیوں کو آخری سلام کیا۔اس کیفیت کو غلام سکندر غلام نے ایک خمسہ میں یوں بند کیا:

آخری ہے وصال میڈا
ول خیمے ول ڻ محال میڈا
اج باغ تھیا پامال میڈا
ہنڑ جگ سارا ویران ڈسے
جو نہ اکبر پتر جوان ڈسے[۴]

دوہڑا سرائیکی کی سب سے بڑی صنف سخن ہے۔ یہ قدیم صنف ابتدا سے اب تک تواتر سے لکھی جا رہی ہے۔ یہ سرائیکی کی واحد صنف ہے جس کو شعرا نے ہر موضوع کے لیے برتا ہے۔ سرائیکی مرثیہ سب سے زیادہ اس صنف میں لکھا گیا ہے۔ دوہڑا مجالس عزا میں شروع سے آج تک پڑھا جا رہا ہے، اس کو ''بند'' بھی کہتے ہیں۔ دوہڑے کو ذاکرین مختلف سُروں میں پڑھتے ہیں۔ دوہڑے میں باقی اصناف کے علاوہ درد کی کیفیت کو احسن طریقے سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ویسے نوحہ میں بھی درد کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ غلام سکندر غلام نے دوہڑوں کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔ ان کے دوہڑے حزن کی تاثیر سے پُر ہیں۔ بھائی عباس علمدار کی لاش پہ جب امام حسین آئے، تو اس وقت کیا منظر تھا، ان کی زبانی سنیے:

جاں ڈٹھا سرور ویرڻ کوں، کپیاں گیاں باہیں
پرزے پرزے مشک کتھائیں، بازو پین کتھائیں
لا کے گل سوہنے چاچے کوں، رووے اکبر بھر بھر آہیں
فرے رات دے بھرے سوہنے کھڑا فاصلہ علم کناہیں[۵]

غلام سکندر غلام کا کلام فنی و فکری حوالے سے خوبیوں سے بھرپور ہے۔ جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، لفظوں کی تکرار ان کی شاعری میں اتم ملتی ہے۔ تکرار لفظی کے ساتھ تکرار معنی بھی ان کے

کلام میں پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام کے ایک ایک مصرعے میں معنی کا جہاں پنہاں ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک ایک مصرعے میں تین تین قافیے باندھے ہیں۔ ان کی قادر الکلامی ملاحظہ ہو:

حیران کھڑی، گریان کھڑی، رکھ دھیان کھڑی جنگ جاہ دو
دید بھرا دو، دل صغریٰ دو، ڈیکھاں کھڑی راہ دو
غم کھاوے ہا، دم آوے ہا، کوئی جاوے ہا صغریٰ دو
آ تے کول ونجاں ہا کھول لکھا ہا حال سارا ڈکھیا دو[۶]

غلام سکندر غلام کی طبع شدہ کتب دو سو سے زیادہ تھیں، اب ان میں سے کچھ پرانے کتب خانوں یہ پرانے زائرین عظام کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان کا جو کلام دستیاب ہوا ہے اس کو صفدر کربلائی نے تدوین کرکے ''لیر کتیراں خیمے'' کے نام سے جھوک پبلشرز ملتان سے ۲۰۱۵ء میں چھاپا ہے۔ ''لیر کتیراں خیمے'' کے ۲۰۷ صفحات ہیں۔ غلام سکندر غلام کی شاعری کی پرتیں ابھی تک کھلی نہیں ہیں، جب ان کی شاعری مکمل فن و فکر کے حوالے سے جائزہ لیا جائے پھر غلام سکندر غلام کا سرائیکی ادب میں مقام و مرتبہ متعین ہو سکے گا۔ سرائیکی کا یہ نابغہ روزگار شاعر پوری ایک صدی کی بہاریں دیکھ کے ۱۹۰۲ء میں راہی ملک عدم ہوا۔

مولوی فیروزالدین(۱۸۸۹ءم)

مولوی فیروز بستی گڈولہ ضلع بھکر میں پیدا ہوئے، آپ کے والد گرامی کا نام حافظ قادر بخش تھا جو کہ اس کی بستی میں امام مسجد تھے۔ مولوی فیروز کے دادا لاہور کے محلہ عطاراں والہ سے اس بستی میں آکر آباد ہوئے تھے، تاہم مولوی ظہور الحسن اپنے ایک انٹرویو میں جھنگ کے رہنے والے بتاتے ہیں:

''سید علی شاہ اور مولوی محمد فیروز دونوں اصل میں ضلع جھنگ سے تھے، سئیں سید علی شاہ توں منڈے سید سے ہی چھینہ (بھکر) گئے اور مولوی فیروز منڈے سید کے نزدیک دو میل پر موضع ترک ہے، وہاں سے گڈولہ (بھکر) میں سکونت پذیر ہوئے۔''[۷]

مولوی فیروز نے ابتدائی تعلیم مدرسہ دینیہ ٹاٹے پور ملتان سے حاصل کی۔ تعلیم کے بعد جب واپس گھر پہنچے تو سخت بیمار ہو گئے۔ گھر والوں نے بہت علاج کرایا مگر شفایاب نہ ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی غلام

یٰسین اور اللہ بخش بلوچ نے مشورہ دیا کہ امام بار گاہ جا کر مجلس سنو اور اپنے لیے دعا مانگو، مولوی فیروز نے ایک رات مجلس سنی اور اپنے لیے دعا کرائی۔ خدا پاک کی قدرت سے چند دن بعد صحت یاب ہو گئے۔[۸]

چوبیس سال کی عمر میں انہوں نے شیعہ مسلک اختیار کیا اور اس وقت کے استاد الشعرا غلام سکندر غلام کے شاگرد بن گئے اور مجلس پڑھنے کا آغاز کیا۔ بہت جلد ایک کامیاب ذاکر بن کر ابھرے۔ مولوی فیروز کا تعلق مغلوں کے خاندان سے تھا لیکن کچھ لکھاریوں نے ان کی ذات ترک لکھی ہے۔ دائرہ دین پناہ تحصیل کوٹ ادو کی ایک عورت سے شادی کی جو بلوچ قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان میں سے ان کے دو بیٹے ہوئے جن کا نام نذر حسین اور منظور حسین تھے۔ بعد میں یہ دونوں بہت بڑے مرثیہ گو شاعر اور ذاکر بنے۔

مولوی فیروز سرائیکی مرثیے کے بہت بڑے شاعر اور نثر نگار کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے بھی شاعر تھے،ان کو سرائیکی خطے میں اردو مرثیے کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر روبینہ ترین یوں رقمطراز ہیں:

> ''ہم فیروز کو ملتان میں اردو مرثیہ گوئی کی روایت کا بانی قرار دے سکتے ہیں۔ جس نے سب سے پہلے باقاعدہ طور پر فن کی صورت میں فنی پختگی کے ساتھ مرثیے کو اردو زبان میں متعارف کرایا۔''[۹]

انھوں نے سرائیکی مرثیہ کو نیا رنگ اور روپ عطا کیا۔ ان کے کلام میں درد کا دریا بہتا ہے۔ مضامین کربلا بیان کرتے وقت موضوع کی مناسبت سے ایسے لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں کہ شعر خود بخود دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔ مولوی فیروز نے قریباً تمام اصناف شعری میں مرثیے لکھے ہیں۔ ان کے کلام میں قصیدہ، مرثیہ، سلام، نوحہ، سی حرفی، منقبت اور مولود شامل ہیں۔ مولوی فیروز کے کلام میں غزل اور رباعی بھی پائی جاتی ہے۔ ان کا سارا کلام اعلیٰ پائے کا ہے:

> ''فیروز کے مرثیے میں داخلی عنصر زیادہ ہے۔ انہوں نے سرائیکی مرثیے کو نیا رنگ اور صورت عطا کی،الفاظ کے انتخاب میں موضوع کی تقدیس کا ہر جگہ خیال رکھتے ہیں،اپنے دور میں اونچے درجے کا مرثیہ نگار تھے اور شعرا کے شہسوار شمار ہوتے تھے۔''[۱۰]

مولوی فیروز کی شاعری کا ڈنکا بہت دور دور تک تھا، اس لیے لینگوسٹک سروے آف انڈیا کی آٹھویں جلد میں مولوی فیروز کے ایک مرثیے کا انگریزی ترجمہ شامل ہے جس کو سر جیمز ولسن نے کیا تھا، یہ ان کی گرائمر اینڈ ڈکشنری آف شاہ پوری میں بھی شامل ہے۔ وہ مرثیہ یہ ہے:

کتھ مدینہ کتھ شاہ نجف
تھیا شام مقام سکینہ دا
ملک پیغمبر ذات خدا دی
کرن ارمان سکینہ دا
سن آوازہ عمر شمر دا
روح معصوم دا ہاں بہوں ڈردا
سانگ دے اُتوں پیو اکبر دا
رکھے دھیان سکینہ دا"

ان کی شائع شدہ کتب بہت ہیں لیکن اب چند کے علاوہ باقی نایاب ہیں۔ سفینہ غم (حصہ اول تا چہارم)، شمع ماتم، صحیفہ ماتم (حصہ اول تا۱۴)، گلزار ماتم (حصہ اول تا پنجم)، مجمع البحرین (حصہ اول تا دوم)، مجموعہ مرثیہ، فرش ماتم، مہتاب غم (حصہ ۱تا۱۲)، گنجینہ تقاریر (حصہ اول تا دوم)، نہر ماتم اور موج کوثر (حصہ ۱تا۱۰) ان کی کتب ہیں۔

مولوی فیروز شاعر کے ساتھ ساتھ بہت اچھے نثر نگار بھی تھے، ان کا شمار سرائیکی کے ابتدائی نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ سادہ نثر لکھتے تھے اور چھوٹے فقرے ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی نثر میں روانی پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر غضنفر مہدی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''سرائیکی ادب میں نظم و نثر کے امتزاج کا سراغ ہمیں اولاً مولوی فیروز مرحوم کے ہاں ملتا ہے، ان سے قبل بھی نظم کے ساتھ نثر کا رواج جاری ہو چکا تھا۔ مگر باقاعدہ فن کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ مولوی فیروز کے منظوم مراثی اور نظم و نثر کے مرقعوں پر مشتمل کئی مجموعے شامل ہوئے۔''[۱۲]

مولوی فیروز ۱۸۸۹ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔

سید علی شاہ چھینوی (۱۸۲۸ء۔۱۹۰۶ء)

سید علی شاہ چھینوی المعروف سیدٹ شاہ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں سید خاور نقوی اپنی کتاب ''عزاداری سیدالشہداء''میں لکھتے ہیں:

> ''سئیں سید علی شاہ کاظمی نے ۱۸۲۸ء میں موضع منڈے سیداں تحصیل و ضلع جھنگ میں سید شاہ نواز شاہ کاظمی کے گھر آنکھ کھولی۔ سید غلام حسین شیرازی سے ذاکری کا فیض حاصل کیا۔ موضع منڈے سیداں سے نقل مکانی کر کے بھکر شہر کے جنوب مغربی جانب چھینہ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان (حال ضلع بھکر) میں سکونت پذیر ہوئے۔''[۱۳]

سید علی شاہ کا رنگ سرخ اور قد درمیانہ تھا، داڑھی پر مہندی لگاتے تھے، ان کی داڑھی ایک مٹھ برابر تھی، کالے رنگ کے کپڑے پہنتے تھے، ایک بار ایک آدمی نے لباس کا سوال کیا تو اسی وقت انہوں نے اس آدمی کو اپنا لباس اتار دیا۔ سید علی شاہ کی شخصیت مروت، دردمندی اور ہمدردی کا مرقع تھی، سید علی شاہ نے اپنی پہلی مجلس بستی چھینہ میں پڑھی، سید علی شاہ فضائل اور مصائب دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ حمد، نعت، مولود اور منقبت سے اپنی مجلس کی ابتدا کرتے تھے۔

سید علی اپنی ذات میں ایک تحریک کی حیثیت رکھتے تھے، وہ بیک وقت ذاکر، شاعر، مبلغ، مدبر، بردبار، متوکل اور مجاہد انسان تھے، وہ ہز ہائنس نواب خیر پور میرس، کوٹ ڈیجی کے ہاں محرم پڑھتے تھے۔ سید علی شاہ سے پہلے ذاکر اکیلے مجلس پڑھتے تھے۔ سوز خواں ساتھ رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ سید علی شاہ نے پہلی بار اپنے ساتھ سوز خواں رکھے۔ اس طرح اس فن کے وہ موجد تھے:

> ''سید علی شاہ چھینوی وہ پہلے ذاکر تھے، جنہوں نے سوز خوانوں کے ساتھ مجلس پڑھنے کی ابتدا کی۔ ان سے پہلے ذاکر سوز خواں نہیں رکھتے تھے۔ سوز خواں رکھنے کا رواج پہلے پہلے سید علی شاہ نے شروع کیا اور وہ اس فن ذاکری کے موجد تھے۔''[۱۴]

ان کے اس ذاکری امتیاز کو ان کے ایک شاگرد غلام حیدر رفدا نے اپنے کلام میں یوں بیان کیا:

میڈا استاد علی سید ہے
جیڑھا فن جدید دا بانی ہے[۱۵]

سید علی شاہ چھینوی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ چودھویں صدی ہجری کے قریباً تمام مداح خواں اہلبیت ان کے شاگرد تھے: ان میں دبیر سرائیکی غلام حیدر فدا، انیس پنجاب سید غلام حسن شاہ تائب، مولوی نبی بخش مضطر ملتانی، صفدر حسین صفدر، غلام محی الدین، بلبل پنجاب سید شیر شاہ، غلام حسین غمگیں پٹھان، مولوی نذر حسین ترک اور مولوی محمد حسین گدا شامل ہیں۔

انہوں نے نہ صرف عزاداری کے فروغ کے لیے کام کیا بلکہ جو کچھ ان کے پاس ہوتا تھا وہ بھی خیرات کر دیتے تھے۔ سید علی شاہ نے مرثیہ، دوہڑا، نوحہ، خمسہ اور بحر کی اصناف میں شاعری کی، ان کا دوہڑا درد کا بے انت سمندر ہے۔ وہ دوہڑا لکھنے کے لاجواب شاعر تھے:

سنڑ آواز عباس دا سرور خاک اُتے جھٹ پیا
رو رو آکھنے فوج میڈی دا بس ہنڑ خاتمہ تھیا
جیں ویر دی دھیر شبیر کوں ہائی او تاں مارا گیا
کیویں ونجاں لاش اُتے نیں زور کمر دا رہسیا

کرو لطف کرم اے زیب حرم نہ رہے دنیا دا غم اے
ہک غم الم، تیڈا ہر دم، میکوں راہوے شاہ امم اے
روسیاہ مداح اپنے دی تیکوں لاج شرم اے
بن یاد تیڈی دے سید علی دا کوئی نہ گزرے دم اے[۱۶]

علی شاہ کی کتب میں انیس الذاکرین، بحر البکا، تحفہ الذاکرین، تصویر کربلا، تقریرات، در بے بہا، خزینۃ البکا، خزینۃ المصائب، ذخیرہ ماتم، زینت البکا، سید الشہدا، فانوس زہرا، فیض البکا، سید الحسین، مشہد الشہدا، مصائب المجالس، مجموعہ مرثیہ، مظہر البکا، مقصود الذاکرین، نعرہ حیدر جدید، متعات غم، مخزم البکا،

ذریتہ البکا، انوار مصائب، مجمع البحرین اور معراج المصائب شامل ہیں۔ سید علی شاہ چھینوی نے ۱۸۰۶ء میں وفات پائی اور قصبہ چھینہ ضلع بھکر میں مدفن ہیں۔

دبیر سرائیکی، غلام حیدر فدا (۱۸۸۰ء۔۱۹۴۳ء)

سرائیکی مرثیے میں دبیر سرائیکی غلام حیدر فدا کا نام نامی بہت بلند ہے۔ ان کو سرائیکی رثائی ادب میں نئی طرز اور اسلوب ساز شاعر مانا جاتا ہے۔ غلام حیدر فدا کی پیدائش اور ان کے آبائی علاقے کے بارے میں مرید عباس عارف اپنی کتاب ''سرائیکی مرثیے وچ نثر'' میں یوں لکھتے ہیں:

> ''غلام حیدر فدا ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی کا نام میاں اللہ بخش تھا ان کے والد گرامی ڈیرہ اسماعیل خان سے ہجرت کر کے موضع سیال ضلع بھکر آن آباد ہوئے۔ ان کے بعد خود اور ان کے چھوٹے بھائی محمد حسین گدا اور صادق حسین وہاں سے کروڑ لعل عیسن ضلع لیہ میں اپنا گھر بسایا۔''[۱۷]

انہوں نے ابتدائی تعلیم کروڑ لعل عیسن سے حاصل کی، ان کی تعلیم صدر الفاضل تھی۔[۱۸] تفسیر، فقہ، منطق، حکمت اور شاعری کے علوم انہوں نے باقاعدہ پڑھے تھے، ان کو عقلی اور نقلی علوم پر بھی قدرت حاصل تھی۔[۱۹] غلام حیدر فدا کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ سرائیکی رثائی ادب کی تاریخ میں کوئی بھی مرثیہ گو شاعر اتنی زبانوں پر دسترس نہیں رکھتا تھا، جتنی زبانیں غلام حیدر فدا کو آتی تھیں:

> ''ان کو عربی، فارسی، پشتو، پوربی، سرائیکی، ہندی، پنجابی، اردو، بھاشا اور بنگلہ زبانوں پر عبور تھا۔''[۲۰]

غلام حیدر فدا صرف ان زبانوں کو نہ صرف جانتے تھے بلکہ اس کو ان زبانوں کے ادب سے بھی واقفیت تھی، فدا ایک وسیع مطالعہ شخص تھے۔ اسلامی علوم پر ان کو مکمل دسترس تھی، عربی اور فارسی علوم کا فاضل علم رکھتے تھے۔

ان کو شاعری سے ابتدا ہی سے شغف تھا، وہ شاعری اور ذاکری میں استاد الذاکرین سید علی شاہ چھینوی کے شاگرد تھے۔ غلام حیدر فدا کو اعلیٰ پائے کی شاعری کے سبب ''دبیر سرائیکی'' کا خطاب دیا گیا۔ اردو ادب میں

واقعات کربلا کے بیان میں جو مقام دبیر کا ہے، وہی مقام سرائیکی ادب میں غلام حیدر فدا کا ہے۔ غلام حیدر فدا شخصیت کے حوالے سے شریف النّفس انسان تھے، ان کی شخصیت کے حوالے سے سید کرامت علی لکھتے ہیں:

> ''کردار کے لحاظ سے مولوی صاحب ایک فرشتہ سیرت انسان تھے، طبعیت میں انکسار حد درجہ تھا، عبادت کے پابند تھے۔ مزاج میں جود و سخا اور ایثار کا جذبہ نمایاں تھا۔ خوش مزاج اور خوش اخلاق آدمی تھے۔ نہ کبھی کسی سے ترش کلامی کی اور نہ کبھی کسی شخص کی غیبت کے روادار ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے، بڑے، اپنے، بیگانے سب ان کا احترام کرتے تھے۔''[۲۱]

فدا کی شاعری مختلف انگ اور رنگ سے عبارت ہے۔ انہوں نے سرائیکی کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا کلام ان کے ہمعصر شعرا سے جدا ہے۔ ان کے کلام میں ہم کو دو آنگی ملتی ہے۔ کہیں پہ الفاظ کی شان و شوکت، کہیں عربی، فارسی الفاظ کی کثرت اور کہیں پہ انداز فکر عالمانہ ہے۔ کہیں پہ وہ سادگی اور سیدھے سادھے جذبوں سے سیدھے سادے انداز سے عکاسی کرتے ہیں۔ فدا حرب و فرب لکھنے کا شیر تھا۔ انہوں نے سرائیکی صنف بحر اپنے کمال و فن کا مکمل مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اس صنف میں عجیب عجیب تجربے کیے۔ بحر غلام حسن شاہ تائب اور غلام حیدر فدا کی پسندیدہ صنف تھی۔ غلام حیدر فدا نے بحر میں حرب و ضرب کے ایسے نقشے کھینچے جیسے بندہ خود جنگ میں موجود ہوا اور اپنی آنکھوں سے جنگ کا نظارہ کر رہا ہو۔ ان کی ایک بحر کا نمونہ دیکھیں:

جڈاں تازے تازے ثمر باغ زہرا دے بن کربلا وچ لٹیجن لگے
ریاض شہ دین و دنیا وچوں او مہکدے ہوئے گل چوٹیجن لگے
او پُر خار بن کربلا دے جڈاں ریت رت نال حاشیے بھریجن لگے
شاہ دین دے وارو واری جڈاں فوج دے سارے افسر مریجن لگے
جو اکبر شہید پیغمبر جھیاں دے سناں نال سینے چوٹیجن لگے
یا عباس غازی جری نامور دے ظلم نال بازو کپیجن لگے
گل نا شگفتہ ریاض نبی تیر دی نوک دے وچ پوویجن لگے
فدا جا بجا فاتحہ دے غریباں کوں مہنے تے طعنے سنبھی جن لگے [۲۲]

اسی طرح ان کے دوہڑے مصائب سے بھرے پڑے ہیں، ان کے دوہڑوں میں درد کی گہرائی اور گیرائی ملتی ہے۔ ان کے دوہڑے چار مصرعے کے علاوہ آٹھ مصرعوں کے بھی ملتے ہیں۔ ان کے ایک دوہڑے میں درد کی کیفیت کا اندازہ کریں:

قیدی پتر حسین دا ہے، بیمار مدت دا ماندا
ہتھ مہاراں نیر ہزاراں پندھ مریندا آندا
دوش نبی عربی تے جیڑھا چڑھدا جڑدا ٹھاندا
ول ڈیکھ اوہیں دے سر کوں آندے سانگ تے جھوٹے کھاندا [۲۳]

فدا ایک زودنویس شاعر تھا، مرثیہ کے علاوہ ایک انہوں نے منظوم قصہ بھی لکھا تھا، قصہ نجمہ و قیس ان کا شہکار ہے۔ یہ بحر کی صنف میں ہے اور قریباً بارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کا مخطوطہ مرید عارف کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کثیر کتابیں ملتان اور آگرہ کے مطبع خانوں سے چھپی تھیں، کچھ تو لوگوں کے پاس موجود ہیں اور کچھ نایاب ہیں۔ غلام حیدر فدا کا بہت سا کلام غیر مطبوعہ ہے جو ان کے ورثاء کے پاس موجود ہے۔ غلام حیدر فدا نومبر ۱۹۴۳ء میں فوت ہوئے۔

سید امام علی شاہ شفیق (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۶۲ء)

سید امام علی شاہ شفیق کی ولادت کے بارے میں سید کرامت علی کاظمی لکھتے ہیں:

''۲۵ دسمبر ۱۸۷۷ء کو پنجاب کے مردم خیز علاقہ لیہ کے قصبہ شاہ پور کے معروف خاندان سادات میں آپ کی ولادت باسعادت ہوئی، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی السید نواز علی شاہ تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت قادر شیر کی وساطت سے امام ہفتم حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے جاملتا ہے۔''[۲۴]

آپ نے ابتدائی تعلیم اس وقت کے رواج کے مطابق عربی، فارسی، قرآن، حدیث، فقہ، صرف، نحو، علم الکلام اور منطق وغیرہ میں حاصل کی۔ ان کو سرائیکی کے علاوہ اردو، ہندی، سندھی اور بلوچی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ انگریزی زبان وادب سے بھی آشنائی رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ فوج میں رہے۔ ان کے خاندان کا پیشہ زراعت تھا۔ شاعری میں پہلے سید علی شاہ چھینوی سے اور بعد میں مولوی غلام حیدر فدا سے اصلاح لی۔ ان کے شاگردوں میں واحد بخش منشی، اعجاز حسین شیخ، غلام رسول، شمع، پتنگ، سید امیر حسین شاہ، اور غلام حیدر شاہ بے کس شامل تھے۔[۲۵]

سید امام علی شاہ شفیق کی شاعری کی خصوصیات کے بارے میں ڈاکٹر شکیل پتافی یوں رقمطراز ہیں:

''سلاست، فصاحت، بلاغت اور روانی شفیق کے کلام میں بدرجہ اُتم پائی جاتی ہے، وہ تشبیہات اور استعارات کے ذریعے کلام میں حسن اور زور پیدا کرنے کا فن بخوبی جانتے تھے۔''[۲۶]

سید امام علی شاہ اعلیٰ مزاج اور اخلاق کے مالک تھے۔ قناعت، جود و سخا اور ایثار کا جذبہ ان کی ذات میں نمایاں تھا۔ عشقِ محمد اور آل محمد ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا:

''خوش اخلاقی، خوش مزاجی اور کم گوئی آپ کے خاص اوصاف ہیں، زندگی بھر کسی کے ساتھ ترش کلامی نہ کی، یہی وجہ ہے کہ چھوٹے بڑے اپنے بیگانے سب آپ کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔''[۲۷]

وہ شعر و شاعری بچپن سے کرتے تھے، پہلے انہوں نے محبت تخلص اختیار کیا بعد میں شفیق رکھ لیا۔ آپ کی شاعری اوصاف سے بھری پڑی ہے۔ فنی محاسن ان کی شاعری میں بھرپور ہیں۔ تکرار لفظی اور تکرار معنوی ان کے کلام میں اُتم ملتے ہیں۔ تکرار لفظی کی ایک مثال ملاحظہ کریں:

چن پہلی ماہ محرم دا جڈاں آن فلک تے چڑھیا
چن دو ڈیکھ تے چن زہرا دے چا انا اللہ پڑھیا
توں ہیں چن فلک دا میں ہاں چن زہرا آ جوڑ عجائب جڑیا
توں تاں تاریاں نال آباد راہسیں میڈا اجڑ ویسی گھر بھریا[۲۸]

تکرار لفظی کے ساتھ ساتھ تکرار معنوی کی ایک مثال ملاحظہ کریں۔ جس میں ''وسدا'' کو انہوں نے مختلف معنوں میں برتا ہے اور لفظ ''وسدا'' ہر مصرعے میں نئے معنی کے ساتھ کس طرح بچ رہا ہے:

جے وسدا ہا پیو اکبر دا ہا جگ توں وکھرا وسدا
وسدا ڈیکھ تے خوش تھیندا ہا یثرب دا کل وسدا
وسدا رسدا ایجھاں اجڑیا زہرا دا گھر وسدا
چالھی سال علی عابد دا ریہا خون اکھیں توں وسدا[۲۹]

ان کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ انہوں نے اپنی تمام شاعری میں کوئی بناوٹی زبان استعمال نہیں کی بلکہ سرائیکی زبان کا معیاری لہجہ اور مستعمل الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کی شاعری ہر عام و خاص میں مقبول ہے۔ ان کی زبان ایسی معلوم ہوتی ہے جیسی آج کی زبان ہو۔ انہوں نے جان بوجھ کر عربی فارسی زبان کے الفاظ استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی دھرتی میں بولی جانے والے الفاظ کو برتنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس لیے ان کا کلام پڑھ کر محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کلام ایک صدی پہلے لکھا گیا:

ہکل عباس دی سن کر سینڑیں برقعے پاونڑ لگیاں
آپوں آپ گھراں دے بیبیاں طاق ولاونڑ لگیاں
چھوٹے چھوٹے بالاں کوں ڈکھیاں ماواں چاونڑ لگیاں
کونجاں پہاڑ نبوت دیاں گل لگ کرلاونڑ لگیاں[۳۰]

سید امام علی شاہ شفیق ۱۸ اگست ۱۹۶۲ء کو جمعرات کی شام کو ہمیشہ کے لیے غروب ہو گئے۔ آپ کا مزار دربار حضرت قادر شیر قصبہ شاہ پور لیہ میں موجود ہے۔ اب آپ کے پوتے نے ان کے کلام ''کلیاتِ شفیق'' کے نام سے جھوک پبلشرز ملتان سے ۲۰۱۰ء میں شائع کیا ہے لیکن بہت سا کلام اب بھی غیر مطبوعہ موجود ہے۔

حوالہ جات

۱۔ پیراصحابی،خلش،ملتانی مرثیہ(لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،۱۹۸۶ء)،ص۳۷۔

۲۔ کندانی، غلام حر خان، پیش لفظ، گلدستہ کونین، سید گانموں شاہ واصف(کروڑ لعل عیسن: ۲۰۰۷ء)،ص۱۷۔

۳۔ زوار حسین بھٹہ،سرائیکی اور اردو مرثیے کا تقابلی جائزہ،مقالہ برائے ایم فل اردو،(اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۰۲ء)،ص۹۴۔

۴۔ غلام سکندر خان غلام،لیر کتیراں خیمے(ملتان: جھوک پبلشرز،۲۰۱۵ء)،ص۱۹۳۔

۵۔ ایضاً،ص۲۳۹۔

۶۔ ایضاً،ص۲۶۔

۷۔ ظہور الحسن، مولانا، انٹرویو، نقیبان کربلا، صفدر حسین ڈوگر(اسلام آباد: عالمی مجلس اہلبیت، ۱۹۹۳ء)،ص۱۳۷۔

۸۔ پیراصحابی،خلش،ملتانی مرثیہ،ص۶۲۔

۹۔ روبینہ ترین،ڈاکٹر، تاریخ ادبیات ملتان(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۲۰۱۲ء)،ص۶۳۔

۱۰۔ زوار حسین بھٹہ،سرائیکی اور اردو مرثیے کا تقابلی جائزہ،ص۹۸۔

۱۱۔ ناصر، نصر اللہ، ڈاکٹر، سرائیکی شاعری دا ارتقا (ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ،۲۰۰۷ء)، ص۴۵۲۔

۱۲۔ غضنفر مہدی، ڈاکٹر، سرائیکی مرثیہ(اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت،۲۰۱۰ء)،ص۱۱۰۔

۱۳۔ خاور نقوی،عزاداری سید الشہدا،حصہ دوم(اسلام آباد: عکاس پبلی کیشنز،۲۰۱۶ء)،ص۴۸۔

۱۴۔ عارف،مرید عباس، سرائیکی مرثیے وچ نثر(ملتان: جھوک پبلشرز،۲۰۱۶ء)،ص۴۲۔

۱۵۔ ایضاً، ص۴۲۔

۱۶۔ صفدر کربلائی (مرتّب)،دبستان کچھی (چوک اعظم: اردو سخن پاکستان،۲۰۱۷ء)، ص۱۶۶۔

۱۷۔ عارف، مرید عباس، سرائیکی مرثیے وچ نثر، ص۱۷۔

۱۸۔ تھند، نور محمد، مہر، تاریخ لیہ (لیہ: لوک پنجاب پبلشرز،۱۹۹۵ء)، ص۳۹۷۔

۱۹۔ کرامت علی کاظمی، لیہ کا ادبی منظر نامہ، مقالہ برائے ایم اے اردو، (ڈیرہ غازی خان: گورنمنٹ کالج،۱۹۹۰ء)، ص۲۷۔

۲۰۔ تھند، نور محمد، مہر، تاریخ لیہ، ص۳۹۷۔

۲۱۔ کرامت علی کاظمی، لیہ کا ادبی منظر نامہ، ص۲۸۔

۲۲۔ فدا، غلام حیدر، مجالس غم (قلمی)، مملوکہ: مرید حسین عارف، سردار مائی لائبریری فاضل پور

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ شفیق، سید امام علی شاہ، کلیات شفیق (ملتان: جھوک پبلشرز،۲۰۱۰ء)، ص۵: ۴۔

۲۵۔ کرامت علی کاظمی، لیہ کا ادبی منظر نامہ، ص۳۵۔

۲۶۔ شکیل پتافی، ڈاکٹر، جنوبی پنجاب میں اردو شاعری (ملتان: جھوک پبلشرز،۲۰۰۸ء)، ص۲۷۲۔

۲۷۔ شفیق، امام علی شاہ، کلیات شفیق، ص۱۲۔

۲۸۔ ایضاً، ص۵۱۔

۲۹۔ ایضاً، ص۴۱۔

۳۰۔ ایضاً، ص۴۶۔